مال اورعزت وآبرو کی حفاظت اور پوری ملّت کو اجتماعی ضرر سے بچانے اورحقوق شہریت کو برقرار رکھنے کے لئے میڈیکل انشورنس کروانا مجبوری ہے ۔

شیخ وھبہ الزحیلی نےلکھا ہے:

یجوز التأمین الاجباری او الالزامی الّذی تفرضه الدولة لانّه بمثابةدفعضریبةللدولة۲۳ ۔

"اجباری یالازمی انشورنس، جسےحکومتیں ضروری قرار دیتی ہیں، جائز ہے۔ اس لیے کہ وہ بہ منزلہ ٹیکس کے ہے، جوحکومت کوادا کیا جاتاہے"۔

خلاصۂ بحث

خلاصہ یہ کہ عمومی حالات میں میڈیکل انشورنس نا جائز ہے، کیوں کہ اس میں غرر، رباا ور جوا جیسے مفاسد پائے جاتے ہیں، جن کی شریعت اسلامیہ میں ممانعت ہے۔ البتہ جن مما لک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے باشندوں کے لیے قانوناً لازمی ہے ،وہاں قانونی مجبوری کے تحت اور بہت سے مفاسد سے بچنے کے لیے اس کی اجازت ہوگی ۔تا ہم انشورنس کرانے والے کے لیے اپنی جمع کردہ رقم سے زائدرقم کواستعمال کرنا جائزنہیں ہے ۔

حواشی ومراجع

۱۔ مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی، ص ۱۴، قرارداد نمبر: ۱۴۹

۲۔ الانفی محمدجبیر، التأمین الصحی واستخدام البطاقات الصحیۃ، مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی، الدورۃ ۱۳، مجلد ۳، ص ۴۶۷

۳۔ الخیاط، محمدہیثم، التامین الصحی، بحوث مجلۃ الفقہ الاسلامی، الدورۃ ۱۳، مجلہ ۳، ص ۴۲۷

۴۔ نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص ۲۱۴

۵۔ مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی، العدد ۱۳، ص ۱۲

۶۔ الکاسانی، ابوبکر مسعود بن احمد، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، دارالکتاب العربی ۱۹۸۲ء، ج ۲، ص ۵۳

۷۔ حاشیہ ابن عابدین، ج ۴، ص ۱۰۹

۸؎ البہوتی، منصور بن یونس بن ادریس، شرح منتہی الارادت، بیروت، المکتب الاسلامی، ۱۴۰۲ھ، ج ۲، ص ۱۴۵

۹؎ ابوالقاسم، محمد رافعی علامی، فتح العزیز شرح الوجیز، بیروت، دارالمعرفۃ ۱۳۹۳ھ، ج ۸، ص ۱۲۷

۱۰؎ الشیرازی، ابی اسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف، المہذب فی فقہ الامام الشافعی، بیروت، دارالفکر، ۱۳۳۴ھ، ج ۸، ص ۱۳۶

۱۱؎ رملی، شمس الدین محمد بن احمد، نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج، بیروت، دارالفکر، ۱۴۰۴ھ، ج ۴، ص ۲۴۵

۱۲؎ فتح الباری، ج ۵، ص ۲۶

۱۳؎ نووی، یحییٰ بن شرف، کتاب المجموع شرح المہذب للشیرازی، بیروت، دارالفکر، ۱۹۹۷ئ، ج ۲، ص ۵۶

۱۴؎ المغربی، محمد بن محمد ابوعبداللہ، مواہب الجلیل، بیروت، دارالفکر، ۱۳۹۸ھ، ج ۴، ص ۳۶۲

۱۵؎ حاشیہ قلیوبی علی شرح المنہاج، ج ۲، ص ۵۸

۱۶؎ الدسوقی، شیخ شمس الدین محمد بن عرفہ، حاشیہ الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دارالفکر، ۱۴۰۶ھ، ج ۳، ص ۲۵

۱۷؎ دردیر، احمد بن محمد بن احمد، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک، مصر، دارالمعارف، ۱۴۰۴ھ، ج ۳، ص ۱۴۵

۱۸؎ السرخسی، محمد بن ابی سہل، المبسوط، بیروت، دارالمعرفہ، ۱۴۰۴ھ، ج ۷، ص ۹۸۶

۱۹؎ شامی، ج ۷، ص ۳۹۵ ۲۰؎ ایضاً، ص ۳۹۶

۲۱؎ معجم لغۃ الفقہائ، ص ۲۳۶ ۲۲؎ الاشباہ والنظائر للسیوطی، ص ۵۶

۲۳؎ الفقہ الاسلامی وأدلتہ، ج ۲، ص ۲۴۶

☆☆☆

سیر وسوانح

امام ابوعمرو عبدالرحمن الاوزاعیؒ

علمی مقام اور بین الاقوامی مسائل میں ان کے اجتہادات

مولانا اختر امام عادل قاسمی

امام ابوعمرو عبدالرحمن الاوزاعی (۸۸۔ ۱۵۷ھ) دوسری صدی ہجری کی ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں، جنہوں نے اپنے عہد پر بہت گہرے اثرات ڈالے ہیں اور جن کے علم وفضل کی شہادت بڑے بڑے علماء اور اعیان وقت نے دی ہے۔ انہوں نے کئی اسلامی خلفاء اور حکم رانوں کا زمانہ پایا۔ خلافت بنی امیہ کا عروج بھی دیکھا اور زوال بھی۔ انہوں نے بنی امیہ میں سے ولید بن عبدالملک (م ۹۶ھ) سے مروان بن محمد (م ۱۳۲ھ) تک مسلسل سات خلفاء کا زمانہ دیکھا۔ اس کے بعد خلافت عباسیہ کا دور شروع ہوا اور ابوالعباس السفاح (م ۱۳۶ھ) اور ابومسلم خراسانی (م ۱۳۷ھ) جیسے خلفاء اور سالاروں نے بنی امیہ کے قصر خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی اور مواخذہ و انتقام کے ایسے ایسے مظاہرے ہوئے جن سے اسلامی حکم رانی کی تاریخ اب تک نا آشنا تھی۔ یہ سب کچھ امام اوزاعیؒ کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ابوالعباس سفاح کے بعد خلافت پر اس کا چچا عبداللہ بن علی ناجائز طور پر قابض ہو گیا۔ بڑی مشکل سے یہ خلافت ابوجعفر منصورؒ (م ۱۵۸ھ) کو ملی، اس میں امام اوزاعیؒ کی مساعی کا بڑا دخل تھا۔ اس بنا پر منصور ہمیشہ ان کا احسان مند رہا۔ منصور کے دورِ خلافت ہی میں امام اوزاعی کا انتقال ہوا، یعنی خلافت بنی امیہ سے خلافت عباسیہ تک پورے دس حکم رانوں کا زمانۂ حکومت انہوں نے دیکھا، بہت سے سرد وگرم چکھے، بے شمار تجربات ہوئے اور فکر ونظر میں وسعت پیدا ہوئی۔

علمی ودینی عروج واقبال کا دور

یہ تو سیاسی حکم رانی کا حال ہے۔ اس دور میں علم وفضل اور زہد وتقوی کی فراوانی کا بھی یہی حال تھا۔ پورا عہد علماء ومحدثین اور اصحاب کمال سے لبریز تھا۔ اسلام کی علمی تاریخ کا یہ سب سے خوب صورت دور تھا۔ اہلِ علم اور اصحاب وفضل و

کمال کی بہ یک وقت اتنی بڑی تعداد نہ اس سے پہلے کبھی دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد۔ اس دور کی چند نمایاں شخصیات درج ذیل ہیں:

☆ بصرہ میں: حضرت حسن بصریؒ (۲۱۔۱۱۰ھ)، حکم بن عتیبہؒ (۱۱۳ھ)

☆ شام میں: مکحول الشامی (۱۱۲ھ)

☆ مکہ معظّمہ میں: عطا بن ابی رباح (۲۷۔۱۱۴ھ)، سفیان بن عیینہؒ (۱۰۷۔۱۶۱ھ)

☆ مدینہ منورہ میں: ربیعۃ الرائیؒ (۱۳۶ھ)، امام مالکؒ (۹۳۔۱۷۹ھ)

☆ یمن میں: طاؤس بن کیسانؒ (۳۳۔۱۰۶ھ)

☆ مصر میں: لیث بن سعدؒ (۹۳۔۱۷۵ھ)، یزید بن ابی حبیبؒ (۵۳۔۱۲۸ھ)

امام شافعیؒ کی عمر امام اوزاعیؒ کی وفات کے وقت سات سال کی تھی، امام احمد بن حنبلؒ ان کی وفات کے سات سال بعد اور اہلِ خراسان کے امام اسحاق بن راہویہؒ چار (۴) سال بعد پیدا ہوئے۔ امام محمد بن جریر طبریؒ کی ولادت ان کی وفات کے ستتھر (۷۷) سال بعد ہوئی۔

امام اوزاعیؒ کے فضل و کمال کا اعتراف

ایسے مبارک دور میں اور ایسے اصحاب کمال کی موجودگی میں امام اوزاعیؒ نے خداداد صلاحیت اور بے پناہ علم کی بدولت ایک ممتاز مقام بنایا اور اپنے علم و عمل، زہد و تقویٰ، احتیاط اور قوت ایمانی کی بنا پر ایسی انفرادیت حاصل کی کہ ایک زمانہ نے اعتراف کیا، مثلاً: اسحاق بن روہویہ کہتے ہیں: ''جس مسئلہ پر امام ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور امام مالکؒ متفق ہو جائیں اس کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں''۔[۱]

عبد الرحمن بن مہدیؒ فرماتے ہیں: ''چار حضرات امام زمانہ تھے: کوفہ میں امام ثوریؒ، حجاز میں امام مالکؒ، شام میں امام اوزاعیؒ، اور بصرہ میں حماد بن زیدؒ''۔[۲]

یحییٰ بن معینؒ کا قول ہے: ''علماء چار ہیں: امام ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام

مالکؒ اور امام اوزاعیؒ''۔ ۳؎

ابواسحٰق فزاریؒ نے کہا: ''امام اوزاعیؒ عام انسانوں کے رہ نما تھے۔ اگر مجھے اس امت کے لیے امام وخلیفہ کے انتخاب کا اختیار ہوتا تو میں امام اوزاعیؒ کو منتخب کرتا''۔ ۴؎

ولید بن مسلم کہتے ہیں: ''میں نے امام اوزاعیؒ سے زیادہ عبادت گزار نہیں دیکھا''۔ ۵؎

ابراہیم بن محمد الفزاریؒ فرماتے ہیں: ''اگر امت کو سخت مشکل پیش آئے اور امام اوزاعیؒ ان کے درمیان موجود ہوں تو سارے لوگ ان کی طرف رجوع کریں گے''۔ ۶؎

عوامی مقبولیت

امام اوزاعیؒ بلاتفریق مذہب وملت ہر طبقہ میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی محبت، رحم دلی، دیانت، انابت الی اللہ، عزم راسخ، قوت ایمانی، جرأت وعزیمت، وفور علمی اور تواضع وانکسار نے ان کو محبوب خاص وعام بنا دیا تھا۔ خاص طور پر شام میں ان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے بعد کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کی وفات کی خبر سے پورے شام میں کہرام مچ گیا۔ مسلمان تو مسلمان، یہود ونصاریٰ اور قبطی بھی اس کاروانِ غم میں شریک تھے۔ سب بے حد غم زدہ تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کسی کی موت پر اقوام وملل کا ایسا اجتماعی کرب وغم تاریخ نے بہت کم دیکھا ہے۔ ۷؎

امام اوزاعیؒ ایک مستقل فقہی مسلک کے بانی

امام اوزاعیؒ 'امام اہلِ شام' کے نام سے شہرت رکھتے تھے۔ وہ ایک مستقل فقہی مسلک کے بانی ہیں۔ ان کا قیام ملک شام میں تھا، اس لیے قدرتی طور پر اہلِ شام نے ان کے مسلک کو قبول کیا۔ بڑے بڑے علماء ومحدثین ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، مثلاً ابو اسحٰق الفزاریؒ، اسماعیل بن عبد اللہ بن سماعہؒ، سفیان ثوریؒ، سعید بن عبدالعزیزؒ، شعبہ بن الحجاجؒ، ولید بن مزید، عبداللہ بن المبارکؒ اور یحییٰ بن یحییٰ الغسّانیؒ وغیرہ۔ ۸؎ ان میں سے کئی حضرات ان کے فقہی مسلک کے زبردست وکیل رہے۔

مسلک اوزاعی شام اور اندلس تک محدود رہا

بیان کیا جاتا ہے کہ بلادِ شام میں تقریباً دوسوبیس (۲۲۰) برس تک اوزاعی مسلک رائج رہا۔ اس دوران امامت و خطابت اور افتاء و قضاء کا منصب اسی مسلک کے لیے مخصوص تھا۔۹؎ اس دور میں مشہور اوزاعی فقہاء میں مفتیٔ دمشق یحییٰ بن یحییٰ الغسّانی (م ۲۱۵ھ) کا نام ملتا ہے۔ ۱۰؎ اسی طرح قاضی رملہ ابوزرعہ دمشقیؒ بھی فقہ میں امام اوزاعیؒ کی طرف میلان رکھتے تھے۔ ۱۱؎ لیکن بعد میں وہ مسلکِ شافعی کے مطابق فیصلے کرنے لگے تھے۔ ان کے ذریعہ شام میں مسلکِ شافعی کو رواج ملا۔ ۱۲؎ اس سلسلے کا آخری نام قاضی دمشق احمد بن سلیمان بن ایوب الاسدیؒ (م ۳۴۷ھ) کا ہے۔ جامع دمشق میں ان کا بڑا حلقۂ درس تھا۔ ان کے بعد پھر دمشق میں مسلک اوزاعی کا کوئی حلقۂ درس قائم نہیں ہوا۔ ۱۳؎

اس دور کے مشہور فقہاء میں ایک نام عبدالملک بن الحسین (م ۲۳۲ھ) کا ہے، جو حضرت ابورافعؓ مولی رسول اللہ ﷺ کی نسل سے تھے۔ یہ پہلے اوزاعی مسلک کے ممتاز علماء میں سے تھے، لیکن بعد میں جب طیطلہ کے قاضی بنے تو اس مسلک کو چھوڑ کر مالکی مسلک اختیار کرلیا۔ پھر آہستہ آہستہ مالکی مسلک مختلف وجوہ سے پورے دیارِ مغرب میں پھیل گیا۔ بڑے بڑے مالکی فقہاء ان علاقوں میں پیدا ہوئے اور مسلک اوزاعی وہاں سے ناپید ہوگیا۔ ۱۵؎

حیات اوزاعیؒ کے نشیب و فراز

خود امام اوزاعیؒ کی زندگی میں بھی ہمیں عروج و زوال کا عکس نظر آتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ان کے وسیع تر حلقۂ درس کو دیکھ کر حضرت ابراہیم بن ادھمؒ رشک کرتے تھے اور شام کے بڑے بڑے امراء ان کے اثر و رسوخ اور عوامی مقبولیت سے گھبراتے تھے۔ ان کی فقہی مہارت کا یہ حال تھا کہ پچیس (۲۵) سال کی عمر سے ہی انہوں نے فتویٰ دینا شروع کر دیا تھا۔ دنیا ان کی فصاحت و بلاغت اور حسن خط کا لوہا مانتی تھی۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے جملے ضرب الامثال کی طرح مشہور ہو جاتے تھے۔ زمانۂ حج میں علماء

ومحدثین کا ان کے گرد اس قدر ازدحام ہوتا تھا کہ کسی کے بارے میں انہوں نے کوئی بات کہہ دی تو وہ عالمِ اسلام کے آخری حدود تک پہنچ جاتی تھی ۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ بھی ان کے جملوں کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکے تھے ۔ امام ابوحنیفہؒ کے امام اوزاعیؒ سے ہونے والے مناظرات اور امام محمدؒ کی کتاب السیر اس کے بہترین گواہ ہیں ۔ تقریر ایسی فصیح وبلیغ اور اثر انگیز کرتے تھے کہ مجمع میں کوئی انسان اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔خطوط میں جملے ایسے جچے تلے لکھتے کہ شاہی دربادوں کے بلند اقبال منشی اور خوش نویس ان کی نقلیں اتارنے میں فخر محسوس کرتے اور خلیفۂ منصور ان کے خطوط کو سامنے رکھ کر ان کے لکھے ہوئے جملوں سے لذت حاصل کرتا تھا۔۱۶؎ لیکن پھر ان کی زندگی میں ہی وہ وقت بھی آیا کہ بہ قول ابومطہرؒ: ’’زندگی کے آخری ایام میں وہ اپنی حق گوئی کی بنا پر بالکل تنہا رہ گئے تھے، ان کے پاس ایک شخص بھی بیٹھنے والا نہ تھا۔‘‘ ۱۷؎

یہی حال ان کے فقہی مسلک کا ہوا ۔ وہ شام کے علاقہ میں بڑی تیزی سے پھیلا اور اس کے اثرات بلاد مغرب تک پہنچ گئے ،لیکن دوسو(۲۰۰) برس ہی گزرے تھے کہ اس نے اپنے بال و پر سمیٹنے شروع کر دیے ۔اوزاعی مسلک کی باقاعدہ تدوین عمل میں نہ آسکی ، جب کہ امام اوزاعیؒ ان اولین علماء وفقہاء میں سے ہیں جنہوں نے علم کے جمع وتدوین اور تصنیف وتالیف کی طرف توجہ فرمائی ، خاص طور پر شام میں اس معاملہ میں ان سے کوئی سبقت نہیں رکھتا۔ ۱۸؎

امام اوزاعیؒ نے کئی کتابیں تصنیف کیں :

(۱)الرد علی سیر ابی حنیفہؒ (۲)السنن فی الفقہ (۳)المسائل فی الفقہ (۴) مسند الاوزاعی (۵)مسند الشامیین وغیرہ ۱۹؎ مگر آج نہ ان کا مسلک مدوّن حالت میں ہے، نہ ان کی تصنیفات دست یاب ہیں ۔صرف تاریخ کے صفحات پر ان کا تذکرہ ملتا ہے ۔

سیر الاوزاعی ۔ بین الاقوامی مسائل پر ایک شاہ کار

امام اوزاعیؒ کی صرف ایک کتاب آج دنیائے علم کو میسر ہے ،وہ ہے ’سیر الاوزاعی‘ ۔وہ بھی اس لیے کہ یہ کتاب ایک زندۂ جاوید شخصیت ،علم فقہ کے مدوّنِ اول امام ابوحنیفہؒ کے رد میں لکھی گئی تھی ۔ اس کا پسِ منظر یہ بتایا جاتا ہے کہ امام محمدؒ کی

مایہ ناز تصنیف 'کتاب السیر' جو دراصل امام ابو حنیفہؒ کے مسائل سیر کا مجموعہ ہے، امام اوزاعیؒ کی نظر سے گذری تو انہوں نے پوچھا: یہ کس کی کتاب ہے؟ جواب میں امام محمد بن الحسن العراقی کا نام لیا گیا۔ اس پر امام اوزاعیؒ نے یہ تبصرہ کیا: عراق والوں کو رسول اللہ ﷺ کے مغازی وسیر کا کیا علم؟ یہ تو شام وحجاز کی چیز ہے، عراق تو بعد میں فتح ہوا۔ امام محمدؒ کو یہ تبصرہ ناگوار گزرا، چناں چہ انہوں نے 'شرح السیر الکبیر' کے نام سے اس سے بھی زیادہ ایک مفصل کتاب تحریر فرمائی اور جن مسائل کا پہلی کتاب میں اجمال اور اختصار کے ساتھ ذکر آیا تھا ان سب کو دلائل وشواہد سے مزین فرمایا۔ ظاہر ہے کہ امام محمدؒ کو امام اوزاعیؒ کی کتاب اور ان کے بین الاقوامی نظریات کا بھی علم تھا، اسی لیے مسائل کی تفہیم وتشریح میں انہوں نے تھوڑی تفصیل سے کام لیا اور ہر مسئلے کو مدلل کرتے ہوئے ان کی آراء کو پیش نظر رکھا۔ امام محمدؒ نے اپنی کتاب میں امام اوزاعیؒ کا نام نہ لے کر اہلِ شام کا عنوان اختیار کیا اور کہیں کہیں اہلِ حجاز کا بھی نام لیا۔ اسی طرح ہر مسئلہ میں مخالف دلائل کا احاطہ کیا ہے اور ہر ایک کے تشفی بخش جوابات بھی دیے ہیں۔

امام محمدؒ کی یہ دوسری کتاب دیکھنے کے بعد غالباً امام اوزاعیؒ کی رائے متزلزل ہوگئی تھی۔ پہلی کتاب 'السیر الصغیر' میں صرف مسائل تھے۔ دوسری کتاب میں قرآن وحدیث اور روایات کا بڑا ذخیرہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے اور ان کی زبان سے صرف یہ نکلا کہ 'اگر اس کتاب میں احادیث اور روایات کے حوالے نہ ہوتے تو میں کہتا کہ وہ علم بھی وضع کرتے ہیں۔'' اس سے زیادہ وہ اس کتاب پر کوئی تبصرہ کر سکے نہ کسی ردعمل کا اظہار فرمایا۔ یہ کتاب امام محمدؒ کی خواہش کے مطابق ساٹھ (۶۰) جلدوں میں دربارِ خلافت میں پیش کی گئی۔ خلیفۂ وقت بے حد متأثر ہوا اور اس کو مفاخر روزگار میں قرار دیا۔[۲۰]

یہ تو 'السیر الکبیر' کا پس منظر ہے، لیکن امام اوزاعیؒ کی کتاب 'الرد علی سیر ابی حنیفہ'' دراصل امام محمدؒ کی پہلی کتاب 'السیر الصغیر' کا جواب ہے۔ جب یہ کتاب منظر عام پر آئی اس وقت امام ابو حنیفہؒ دنیا میں موجود نہیں تھے۔ ان کے شاگردِ رشید

امام ابو یوسفؒ نے امام اوزاعیؒ کی اس کتاب کا جواب 'الردعلی سیر الاوزاعی' کے نام سے تحریر فرمایا اور ان کے تمام اعتراضات کے مسکت جوابات دیے۔ یہی چیز اس کتاب کی زندگی کی ضمانت بن گئی۔آج دنیا میں لائبریریوں میں امام اوزاعیؒ کی کتاب امام یوسفؒ کی کتاب کے حوالے سے پڑھی جا رہی ہے، ورنہ اس کی اصل کتاب ان کی دیگر کتابوں کی طرح زینتِ تاریخ بن چکی ہے۔۲۱؎

امام ابو یوسفؒ کی یہ کتاب بھی امام اوزاعیؒ تک ضرور پہنچی ہوگی، لیکن اس پر ان کی طرف سے کسی مثبت یا منفی ردعمل کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔ بعد میں امام شافعیؒ کی نظر سے ان دونوں بزرگوں کی تحریریں گزریں تو کچھ تعلیقات انہوں نے بھی ان میں شامل فرمائیں۔انہوں نے اکثر مسائل میں امام اوزاعیؒ کی تائید کی۔ چونتیس (۳۴) بنیادی مسائل میں صرف چھ(۶) یا سات(۷) میں امام ابو حنیفہؒ کی موافقت کی، باقی تمام مقامات پر امام اوزاعیؒ سے اپنے اتفاق کا اظہار کیا ہے اور اس کی دلیلیں بھی فراہم کی ہیں۔اس طرح اس کتاب کو ایک اور زندگی ملی۔تینوں بزرگوں (امام اوزاعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ) کی تحریروں کا مجموعہ 'سیر الاوزاعی' کے نام سے امام شافعیؒ کی مشہور کتاب 'الام' کا حصہ ہے۔۲۲؎

امام اوزاعیؒ کی کتابیں ناپید ہونے کا سبب

امام اوزاعیؒ کی کتابیں ناپید ہونے کا سبب ان کے بعض تلامذہ مثلاً ولید بن مسلمؒ کے حوالے سے مؤرخین یہ بیان کرتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کے زمانے میں بیروت میں زبردست زلزلہ آیا تھا، جس میں بیشتر مکانات منہدم ہو گئے تھے اور کچھ حصوں میں آگ بھی لگ گئی تھی۔امام اوزاعیؒ کا تمام قلمی سرمایہ اسی زلزلے اور آتش زدگی کی نذر ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ بعد میں ایک شخص نے امام اوزاعیؒ کو ان کی ایک کتاب کا جلا ہوا نسخہ لا کر دیا، مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اپنے علمی سرمایہ کو دوبارہ زندگی نہ دے سکے۔انا للہ و انا الیہ راجعون ۲۳؎

فقہ اوزاعیؒ کے اکثر مسائل مذاہب اربعہ میں موجود ہیں

امام اوزاعیؒ کے اکثر اقوال ائمہ میں سے کسی نہ کسی کے یہاں مل جاتے ہیں۔اس کا اندازہ 'سیر الاوزاعی' پر امام شافعیؒ کی تعلیقات اور تبصروں سے ہوتا ہے کہ چند مسائل کو چھوڑ کر اکثر مسائل میں امام شافعیؒ نے ان سے اپنا اتفاق ظاہر کیا ہے اور بعض میں کچھ قیدیں بڑھائی ہیں۔اسی پر ہم امام اوزاعیؒ کے دیگر اقوال و آراء کو قیاس کر سکتے ہیں۔

فقہ کے بہت سے ابواب میں امام اوزاعیؒ کے اقوال موجود ہیں، جن سے ان کے مسلک کا ایک خاکہ تیار ہوتا ہے اور ان کے ذوق و مزاج کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔وہ ایک مستقل فقہی مسلک کے بانی تھے تو ظاہر ہے کہ زندگی کے تمام ابواب کے تعلق سے اس میں قانونی ہدایات رہی ہوں گی اور تقریباً تین صدیوں تک افراد اور ریاستوں نے ان کے عملی تجربات بھی کیے ہوں گے۔یہ تو نظام قدرت ہے، جس کے تحت اس فقہی مسلک کے لیے اتنی ہی زندگی مقدر تھی۔آج جو کچھ بھی موجود ہے وہ اس عظیم مسلک کا بہت تھوڑا حصہ ہے، لیکن اس سے اس کے شان و شکوہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بین الاقوامی مسائل پر امام اوزاعیؒ کی آراء

بین الاقوامی مسائل پر امام اوزاعی کے ان افکار و آراء کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے جو انہوں نے امام ابو حنیفہؒ کے رد میں پیش کیے تھے۔اس مختصر کتاب کا موازنہ اگر ہم امام محمد کی السیر الصغیر یا السیر الکبیر سے کریں تو مسائل کی تعداد کے لحاظ سے دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ امام وزاعیؒ کی اصل کتاب موجودہ کتابی سائز کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ بیس (۲۰) صفحات پر مشتمل ہوگی اوور ان میں بھی بنیادی طور پر صرف چونتیس (۳۴) مسائل سے تعرض کیا گیا ہے۔اس میں ضمنی مسائل کو بھی شامل کر لیں تو ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ چالیس (۴۰) تک پہنچے گی۔ ۲۴؎ علاوہ ازیں امام اوزاعیؒ نے جن مسائل میں اختلاف کیا، ان میں سے اکثر آج کے دور میں بہت

زیادہ اہم نہیں ہیں۔

البتہ بین الاقوامی مسائل میں امام اوزاعیؒ کی ایک اضافی اہمیت یہ ہے کہ وہ خود اس کا عملی تجربہ رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں بیروت کی سرحدی فوج میں ملازمت اختیار کرلی تھی اور اپنی صحت تک اس پر برقرار رہے۔ ۲۵؎ اس لحاظ سے اگر وہ بین الاقوامی مسائل پر کوئی مبسوط کتاب لکھتے تو اسلامی علمی سرمایہ میں یقیناً قیمتی اضافہ ہوتا، یا ان مسائل کے تعلق سے ان کے مسلک کی باقیات موجود ہوتیں تو یقیناً علم وفکر کی بہت سی نئی جہتیں سامنے آسکتی تھیں،لیکن قدّر اللہ ماشاء۔

اس موقع پر اس بحث کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان نظریات میں فکری معنویت کتنی ہے؟ اور امام شافعیؒ کے محاکے اور تعلیقات کس حد تک درست ہیں؟ اس لیے کہ خود امام محمدؒ نے السیر الکبیر میں ان تمام دلائل وشواہد سے تفصیلی بحث کی ہے۔ان کے بعد شمس الائمہ محمد بن احمد السرخسی (م ۴۸۳ھ) نے بھی شرح السیر الکبیر میں مخالف دلائل و اعتراضات کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور آخری دور میں علامہ ابوالوفاء افغانی ثم حیدرآبادیؒ نے امام یوسفؒ کی کتاب 'الرد علی سیر الاوزاعی' پر اپنی قیمتی تعلیقات میں امام شافعیؒ کے تبصروں کو پیش نظر رکھا ہے۔اس طرح یہ بحث مکمل ہوچکی ہے۔

دارالحرب میں مالِ غنیمت کی تقسیم

اگر کسی اسلامی لشکر یا فوجی ٹکڑی کو حالتِ جنگ میں غیر مسلموں کی سرزمین میں کچھ مالی فتوحات (مال غنیمت) حاصل ہوں تو کیا ان کی تقسیم دارالحرب میں ہی فوجیوں کے درمیان کی جاسکتی ہے؟ یا افواج کی مع اموال غنیمت اسلامی ریاست کے مرکز تک بحفاظت واپسی کا انتظار کیا جائے گا؟ امام اوزاعیؒ کے نزدیک دارالحرب میں ہی ان کی تقسیم کی جانی چاہیے۔ ۲۶؎ امام شافعیؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ ۲۷؎ اس لیے کہ ان اموال میں ان فوجیوں کا حق قائم ہو چکا ہے جنہوں نے اس جنگی مہم میں حصہ لیا ہے۔اس بنا پر اس میں وہ شرکت کے حق دار ہیں، جیسا کہ رسولؐ سے متعدد غزوات کے بارے میں منقول ہے۔مثلاً غزوۂ بنی المصطلق، ہوازن، حنین، اور خیبر وغیرہ میں آپؐ

نے مقام جنگ پر ہی مالِ غنیمت کی تقسیم فرمادی ۔ امام اوزاعیؒ کا خیال یہ ہے کہ یہ تسلسل بعد کے ادوار میں (حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عثمانؓ سے حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کی خلافت تک) جاری رہا۔ ۲۸؎

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر فوج کو شدید ضرورت نہ ہو تو دارالحرب میں مال غنیمت کی تقسیم جائز نہیں۔ اسے اس وقت تقسیم کیا جائے گا جب تمام افواج مع مالِ غنیمت بحفاظتِ وطن واپس نہ ہو جائیں ۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بعد میں آنے والی کمک بھی اس میں شریک ہو سکے گی ۔ ایسا نہ کرنے سے کئی اہم متعلق لوگ اپنے حق سے محروم ہو سکتے ہیں ۔ جہاں تک قیامِ حق کا مسئلہ ہے تو یہ اس وقت تک ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ اس پر مکمل قبضہ نہ ہو جائے ۔ ۲۹؎

حضور ﷺ نے حنین کا مال فیی طائف سے واپسی پر مقام جعرانہ میں لوگوں کی طلب پر تقسیم فرمایا تھا۔ ۳۰؎ اسی طرح جنگ بدر میں مالِ غنیمت کی تقسیم مدینہ واپسی کے بعد ہوئی تھی ۔ آپؐ نے اس موقع پر کئی ایسے لوگوں (مثلاً حضرت طلحہؓ اور حضرت عثمانؓ وغیرہ) کو حصہ دار بنایا تھا جو بہ ظاہر جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے لیکن درحقیقت مسلمانوں کے جنگی مفاد ہی میں مصروف تھے ۔ ۳۱؎ رہا خیبر و ہوازن وغیرہ کا معاملہ تو کافروں کی شکست اور صلح کے بعد وہ سارا علاقہ مملکتِ اسلامی کا حصہ بن چکا تھا۔ گو اکثر آبادی وہاں غیر مسلموں کی تھی ،مگر کفر کی شوکت ٹوٹ چکی تھی اور باضابطہ معاہدہ کی روشنی میں اس کو دارالاسلام میں شامل کرلیا گیا تھا ،اس لیے وہاں رہتے ہوئے مال غنیمت کی تقسیم میں مضائقہ نہیں تھا۔ امام یوسفؒ نے اس پر بہت مدلل گفتگو کی ہے اور علّامہ افغانی نے علّامہ سرخسیؒ وغیرہ کی تحقیقات کے حوالے سے امام شافعیؒ کے مباحث کا بھی رد کیا ہے جو انہوں نے امام اوزاعیؒ کے دفاع میں کتاب الام میں تحریر کیے تھے ۔ ۳۲؎

مالِ غنیمت سے ہتھیار لینے کا مسئلہ

امام اوزاعیؒ کے نزدیک مسلم فوجیوں کے لیے امیر کی اجازت کے بغیر مالِ غنیمت میں سے جنگی ہتھیار لینا درست نہیں ،خواہ ان کو اس کی کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو،

الّا یہ کہ عین معرکۂ جنگ میں ، جب کہ شدید مقابلہ جاری ہو ، اس کی نوبت آجائے ، تو بہ قدر ضرورت مال غنیمت میں سے ہتھیار لے کر استعمال کرنے کی اجازت ہے، بہ شرطے کہ معرکہ ختم ہوتے ہی اسے واپس کر دیا جائے اور جنگ سے فراغت کا انتظار نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ اس میں ہتھیار کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ جب تک مال غنیمت کی تقسیم نہ ہو جائے اس وقت تک یہ ہتھیار قومی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور تمام شریک فوجیوں کا ان میں حق ہے، کسی ایک شخص کو بہ طور خود ان میں تصرف کی اجازت نہیں ہے ۔ یہ مالِ غنیمت میں خیانت تصور کی جائے گی۔ ۳۳؎ امام شافعیؒ بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ ۳۴؎ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کی وہ ہدایت ہے جو مالِ غنیمت کے تحفظ کی تاکید اور اس میں خیانت پر وعید کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ ۳۵؎ حضرت رویفع بن ثابت انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حنین کے موقع پر ارشاد فرمایا:

" من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يأخذ من دابة من المغانم فيركبها حتى اذا نقصها ردّها فى المغانم، ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يلبسنّ شيئاً من المغانم حتى اذا أخلقه ردّه فى المغانم"۔ ۳۶؎

"جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ ہرگز مالِ غنیمت سے جانور نہ لے کہ اس پر سواری کرے اور جب وہ کمزور ہو جائے تو اسے واپس کر دے، اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ مال غنیمت سے پہننے کے لیے کپڑا نہ لے کہ جب وہ پرانا ہو جائے تو اس کو واپس کر دے۔"

امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ سخت ہنگامہ خیز حالات نہ ہونے کے باوجود وقتی ضرورت کے تحت مسلم فوجیوں کے لیے مال غنیمت سے سامان حرب استعمال کرنے اور جنگ سے فراغت تک حسبِ ضرورت اپنے پاس رکھنے کی اجازت ہے، البتہ جنگ سے فراغت کے بعد ہتھیار کا واپس کر دینا ضروری ہے۔ امام صاحب کے نزدیک یہ قومی مفاد اور ملک وملت کی عزت وآبرو کا مسئلہ ہے۔ ہتھیار کے بغیر تو کوئی جنگ لڑی نہیں جا سکتی،

اور ہر چھوٹی چھوٹی ضرورت کے لیے امام کی اجازت کی پابندی بھی مشکل ہے، اس لیے حسبِ ضرورت مالِ غنیمت میں سے ہتھیار لے کر اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ۳۷؎

اس رائے کا ماخذ وہ روایت ہے جن میں بوقت ضرورت مالِ غنیمت کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، مثلاً حضرت عبد اللہ بن اوفیؓ بیان کرتے ہیں کہ ''ہم لوگ خیبر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ مالِ غنیمت میں کچھ کھانے وغیرہ کی چیز آتی تھی تو ہر آدمی اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لے لیتا تھا''۔ ۳۸؎

امام شافعیؒ نے امام اوزاعیؒ کا دفاع کرتے ہوئے ہتھیار کو طعام کے مثل ماننے سے انکار کیا ہے، حالاں کہ میدانِ جنگ میں کھانے سے زیادہ ہتھیار کی اہمیت ہے۔ مقابلے کے میدان میں انسان چپ چاپ کھڑا قتل ہو جائے اور ہتھیار غنیمت کے سرد خانے میں پڑے رہیں، یہ کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ امام اوزاعیؒ نے جن روایات کا حوالہ دیا ہے ان کا محمل وہ لوگ ہیں جو بلا ضرورت یا بہ ارادۂ خیانت مالِ غنیمت استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی اس تاویل سے تمام روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

پیادہ اور سوار فوجیوں کے حصوں میں فرق

ایک اہم مسئلہ مالِ غنیمت میں فوجیوں کے درمیان حصوں کے تناسب کا ہے۔ پیادہ فوج اور سوار فوج کے حصوں میں تفاوت قدرتی ہے۔ میدان جنگ میں دونوں کی کارکردگی میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے حصوں کے تناسب میں بھی فرق ہونا چاہیے۔ امام اوزاعیؒ کے نزدیک پیادہ کو ایک حصہ اور سوار کو تین حصہ ملیں گے۔ ان کی دلیل حضرت عمرؓ کی یہ روایت ہے:

"أن رسول اللہ ﷺ قسم فی النفل للفرس بسھمین وللرجل بسھمٍ" ۳۹؎

''رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت کی تقسیم میں گھوڑے کو دو حصے اور مرد کو ایک حصہ مرحمت فرمایا''

امام ابوحنیفہؒ اس فرق کو دو گنے تک محدود رکھتے ہیں، یعنی پیادہ کو ایک حصہ اور سوار کو دو گنا۔ ۴۰؎ اس کا ماخذ وہ صحیح روایات ہیں جن میں صاف طور پر حصے کا

یہی تناسب کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک صحابی بیان کرتے ہیں:

''ثم أعطانی رسول اللہ ﷺ سهمين :سهم الفارس وسهم الراجل فجمعهما لی جميعاً''۴۲۔

''مجھے رسول ﷺ نے دو حصے دیے: ایک گھڑ سوار کا حصہ اور ایک پیادہ کا حصہ۔ دونوں کو میرے لیے جمع کر دیا''

ایک روایت میں مجمع بن جاریہ الانصاریؓ کے حوالے سے ہے:

''فأعطی الفارس سهمين و أعطی الراجل سهماً''۴۳۔

''حضور ﷺ نے گھڑ سوار کو دو حصے دیے اور پیادہ کو ایک حصہ''۔

جن روایات میں 'فرس' کے لیے دو حصے کا ذکر ہے ان میں امام ابو حنیفہؒ 'فرس' بمعنی فارس یعنی شہ سوار اور الراجل' یعنی پیادہ مراد لیتے ہیں، تاکہ روایات میں تطبیق دی جا سکے۔ ایک تاویل یہ بھی کی گئی ہے کہ بعض مواقع پر گھڑ سواروں کو آپؐ نے جو زائد حصے دیے وہ بہ طور غنیمت کے نہیں، بلکہ مال خمس سی بہ طور انعام کے تھے۔ نیز روایات سے دو حصے ملنا تو یقینی طور سے ثابت ہے، مگر تین حصے میں شک ہے، اس لیے شک کی بنا پر تین کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں عقلی اعتبار سے اس میں نقص یہ ہے کہ اگر انسان کے لیے ایک حصہ اور سواری کے لیے دو حصے مقرر کیے جائیں تو لازماً سواری کی اہمیت انسان سے زیادہ ظاہر ہوگی، جو اس کے منصب اشرف المخلوقات کے منافی ہے، نیز کوئی بھی سواری انسانی عقل و دماغ کے تحت کام کرتی ہے، خواہ جنگی جانور ہو یا جنگی مشین، دونوں بہ جائے خود کچھ اہمیت نہیں رکھتے، بلکہ انسان کی حکمت اور ناخن تدبیر کے تحت ان کی افادیت ہے۔ امام اوزاعیؒ کے فلسفے میں انسان سے زیادہ دوسری مخلوق کو اور اصل سے زیادہ واسطہ کو اہمیت دی گئی ہے، جو نا قابلِ فہم ہے۔

دوران جنگ دار الحرب میں شہید ہونے والوں کا حصہ

امام اوزاعیؒ کی رائے میں جو لوگ دوران جنگ دار الحرب میں شہید

ہو جاتے ہیں ، مال غنیمت میں ان کو بھی حصہ ملے گا ، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے موقع پر ایک شہید شخص کو مال غنیمت سے حصہ دیا تھا۔ ۴۵؎

حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ مال غنیمت صرف زندہ لوگوں کے لیے ہے ۔شہید ہو جانے والوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے ۔ ان کے ورثہ اس میں حق وراثت کا دعوی نہیں کر سکتے ۔ اس لیے کہ مال غنیمت میں فوجیوں کا حق 'حق ضعیف' ہے ۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے بدر، احد، حنین اور خیبر، کسی بھی جنگ میں شہداء کا حصہ مقرر نہیں فرمایا۔ اگر کسی موقع پر کسی کو کچھ عطا فرمایا تو وہ بہ طور انعام آپؐ کی خصوصیت تھی ۔ یہ عام دستور نہیں تھا ۔امام یوسفؒ نے امام زہریؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ کسی بھی جنگ میں حضور ﷺ نے شہداء کو شریک غنیمت نہیں فرمایا۔حضرت عبیدہ بن حارثؓ کا انتقال بدر کے موقع پر واپسی میں مدینہ سے پہلے مقام صفراء پر ہو گیا تھا، ان کو بھی غنیمت میں سے حصہ نہیں دیا گیا تھا۔ ۴۶؎

مال غنیمت میں فوجی کمک کا حصہ

دارالحرب میں پہلے سے برسر پیکار فوج کی مدد کے لیے جو فوج پیچھے سے جاتی ہے وہ اگر پہلی فوج کے دارالحرب سے نکلنے سے قبل اس سے جا ملتی ہے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ بھی پہلی فوج کی مالی فتوحات میں برابر کی حصہ دار ہو گی ،لیکن امام اوزاعیؒ کی رائے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ جب تک کہ وہ شریک جنگ نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ارض روم کی جنگی مہموں میں متعدد افواج مختلف علاقوں میں برسر پیکار تھیں ،لیکن مال غنیمت میں ان کو ایک نہیں مانا گیا۔ ۴۷؎ امام یوسفؒ نے متعدد روایات و آثار سے ثابت کیا ہے کہ ایک مہم میں الگ الگ پہنچنے والی ٹکریوں کو ایک ہی تصور کیا جائے گا،اس لیے کہ ہدف ایک ہے،منزل ایک ہے، ایک کو دوسرے سے ہمت و طاقت ملتی ہے ۔ یہ صرف وقفات کا فرق ہے کہ الگ الگ وقتوں میں ٹیمیں پہنچتی ہیں۔ پہلی ٹیم دوسری کی مدد سے فتح حاصل کرتی ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ دوسری ٹیم کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے اہل اوطاس اور اہل حنین کی غنیمت کو ایک قرار دیا تھا۔حضرت عمر بن خطابؓ نے سعد بن ابی

الوقاصؓ کو لکھا کہ میں نے تمہاری مدد کے لیے ایک فوج بھیجی ہے۔ اگر لاشوں کے پھٹنے سے پہلے وہ پہنچ جائے تو اس کو غنیمت میں شریک کرنا۔ ۴۸؎

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں زیاد بن لبیدؓ اور مہاجرین امیہؓ کی مدد کے لیے عکرمہ بن ابی جہلؓ کو پانچ سو (۵۰۰) فوجیوں کے ساتھ بھیجا۔ یہ لوگ پہنچے تو یمن میں نجیر کا علاقہ فتح ہو چکا تھا۔ زیاد بن لبیدؓ (یہ اہلِ بدر میں سے تھے) نے ان کو مالِ غنیمت میں شریک کیا۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ زیاد بن لبیدؓ نے ایسا اپنے طور پر کیا تھا، ورنہ حضرت ابو بکرؓ کی ہدایت یہ تھی کہ مال غنیمت میں سے حصہ اسی کو ملے گا جو واقعہ میں شریک ہو۔ ۴۹؎

فوج میں شریک عورتوں اور نابالغ بچوں کا حصہ

فوج میں جو عورتیں باقاعدہ جنگ کے لیے نہیں، بلکہ زخمیوں کی دیکھ بھال اور دوا علاج کے لیے شریک ہوں اور ان کی شرکت سے فوجیوں کو فائدہ پہنچے، یا نابالغ بچے شامل ہوں، امام اوزاعیؒ کے نزدیک وہ بھی مالِ غنیمت میں حصہ دار ہوں گے۔ امام ابو حنیفہؒ عورتوں اور بچوں کی باقاعدہ حصہ داری کے قائل نہیں، البتہ بہ طور بخشش کے ان کو کچھ دیا جا سکتا ہے، جو بہ ہر حال عام شریک فوجیوں کے حصے سے کم ہوگا۔ امام شافعیؒ بھی اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے ہم خیال ہیں۔ ۵۰؎ امام اوزاعیؒ نے خیبر والی روایت سے استدلال کیا ہے۔ سنن ابی داؤد وغیرہ میں حشرج بن زیاد کی دادی کی روایت ہے، وہ بیان کرتی ہیں کہ ہم کچھ عورتیں خاموشی سے غزوۂ خیبر میں شریک ہو گئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور دریافت فرمایا: تم نے کیوں شرکت کی؟ ہم نے عرض کیا: ہمارا مقصد مسلمانوں کی مدد کرنا، ان کی ہمت بڑھانا اور زخمیوں کا دوا علاج کرنا ہے۔ جب خیبر فتح ہوا تو حضور ﷺ نے ہمیں بھی حصہ مرحمت فرمایا۔ ۵۱؎ مگر محدثین نے اس روایت کو سند کے اعتبار سے ضعیف اور ناقابلِ استدلال قرار دیا ہے۔ ۵۲؎ ایک اور روایت مکحول اور خالد بن معدان سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو بھی حصہ دیا۔ مگر بیہقی

نے اس کو بھی منقطع اور ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ ۵۳؎ اس مسئلہ میں سب سے زیادہ مضبوط روایت حضرت ابن عباسؓ کی ہے، جس سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے:

''قد کن یحضرن الحرب مع رسول اللہ ﷺ فاما ان یضرب لھن بسھم فلا وقد کان یرضخ لھن۔''

'عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میدان جنگ میں حاضر ہوتی تھیں، مگر ان کو حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ بس بہ طور بخشش کچھ دے دیا جاتا تھا'۔

اسی روایت کے اگلے ٹکڑے میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے بچوں کے حصہ کی نفی کی ہے:

''وأنہ لا حق للصبی فی المغنم حتی یحتلم''

'نابالغ بچوں کا بھی مال غنیمت میں حصہ نہیں ہوتا تھا'۔

امام یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر بہت سی روایات ہیں۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ان سب کو بیان کر دیتا۔ ۵۵؎

جنگ میں شریک غیر مسلموں کا حصہ

جمہور فقہاء کے نزدیک جنگ میں بہ وقت ضرورت غیر مسلموں سے فوجی مدد لی جاسکتی ہے، لیکن کیا ان کو مال غنیمت میں بھی عام فوجیوں کی طرح حصہ دار بنایا جائے گا؟ اس سلسلے میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔ امام اوزاعیؒ ان کو بھی برابر درجہ کا شریک قرار دیتے ہیں، جب کہ حنفیہ بہ طور بخشش کچھ دینے کے قائل ہیں، ان کا باقاعدہ حصہ نہیں لگاتے۔ امام شافعیؒ کا بھی یہی خیال ہے۔ ۵۶؎ امام اوزاعیؒ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جن میں حضور ﷺ کی طرف سے مددگار غیر مسلموں کو مال غنیمت میں سے دینے کا ذکر ہے، مگر یہ تمام روایات منقطع یا ضعیف اور ناقابلِ اعتبار ہیں، یا ان کا محمل یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کو بہ طور بخشش کے دیا گیا، نہ کہ بہ طور حصہ۔ اس سلسلے میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت بہت صریح ہے، جس کو حنفیہ نے اپنا ماخذ بنایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''استعان رسول اللہ ﷺ بیھود قینقاع فرضخ لھم ولم یسھم لھم'' ۵۷؎

''حضور ﷺ نے قینقاع کے یہودیوں سے جنگ میں مدد لی، مگر ان کو باقاعدہ حصہ دار نہیں بنایا، بلکہ بہ طور بخشش کے دیا''۔

امام اوزاعیؒ غیر مسلموں کے حق میں کافی نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ غیر مسلم سرزمین پر مسلمانوں کی جنگی کاروائی کے دوران کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر لے اور مسلم فوج سے آملے تو خواہ وہ اختتام جنگ کے بعد آیا ہو، لیکن اگر ابھی مال غنیمت تقسیم نہیں ہوا ہے تو ان کے نزدیک اس نومسلم کو بھی اس میں حصہ دار بنایا جائے گا۔ حنفیہ کے نزدیک جب تک وہ جنگ میں حصہ نہ لے، مال غنیمت میں اس کا حصہ نہیں لگایا جائے گا۔ امام شافعیؒ اس مسئلے میں بھی حنفیہ کے ہم خیال ہیں۔ ۵۸؎

امام ابو یوسفؒ اس پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ایک طرف امام اوزاعیؒ پیچھے سے آنے والی کمک کو مالِ غنیمت میں حصہ دار نہیں بناتے، مگر بغیر شرکتِ جنگ کے نومسلم کو حصہ دار قرار دیتے ہیں۔ یہ حیرت انگیز بات ہے''۔ ۵۹؎

جنگ میں مقتول دشمن کا سامان

جنگ میں کوئی مسلمان کسی دشمن کو قتل کرتا ہے تو اس کا ساز و سامان امام اوزاعیؒ کے نزدیک قاتل کو ملے گا۔ ان کے نزدیک یہی دستورِ جنگ ہے، جب کہ حنفیہ کا موقف یہ ہے کہ اگر امام نے اس طرح کا پیشگی کوئی اعلان نہ کیا ہو تو مقتول کا سامان بھی مال غنیمت میں شامل ہوگا اور تمام شرکاء میں تقسیم ہوگا۔ البتہ اگر کسی جنگ میں حربی مصالح کے تحت امیر کی طرف سے پیشگی اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص کسی کو قتل کرے گا اس کا ساز و سامان اسی کو دیا جائے گا تو صرف اس جنگ کی حد تک یہ اعلان مؤثر ہوگا، مگر یہ دائمی دستور نہیں بنے گا۔ ۶۰؎ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر وغیرہ کے موقع پر قاتلوں کے لیے مقتول کے سامان کا پیشگی اعلان فرمایا تھا، اس لیے قتل کرنے والوں کو مقتول کا سامان دلوایا گیا، لیکن بعد میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی پیشگی اعلان کے بغیر مقتولین کا سامان قاتلوں کو دیا گیا ہو۔

قیدیوں کی امان کا مسئلہ

فوج نے دار الحرب سے چند قیدیوں کو گرفتار کیا، جن میں عورتیں اور بچے وغیرہ بھی تھے، ان کو دار الاسلام لایا گیا اور حسبِ ضابطہ مال غنیمت میں شامل کر دیا گیا، اب اگر مسلمانوں میں سے ایک دو آدمی دعویٰ کریں کہ فلاں اور فلاں یا ان سب کو میں نے پہلے ہی امان دے رکھی ہے، تو اس صورت حال میں کیا ان کی بات کی تصدیق کی جائے گی یا نہیں؟

امام اوزاعیؒ کی رائے میں ان مسلمانوں کی تصدیق کی جائے گی اور تمام متعلقہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، اس لیے کہ قیدیوں کے بارے میں اسلامی ہدایت یہ ہے کہ مسلمانوں کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کی امان بھی قابل قبول ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''المسلمون تتكافأ دماؤهم يسعى بذمّتهم أدناهم''[۶۴]

'مسلمانوں کے خون کی مکافات کی جائے گی اور ان کے ادنیٰ فرد کے ذمہ کی رعایت کی جائے گی'۔

اس معاملہ میں حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اس صورتِ حال میں بغیر معتبر ثبوت کے ان کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔ درست ہے کہ امان کے معاملہ میں ہر مسلمان کا ذمہ قابلِ قبول ہے۔ یہ اس کے ذمہ کو چیلنج نہیں ہے، بلکہ صورتِ حال کی تحقیق ہے۔ آخر ایک فاسق شخص کی بات کیوں معتبر نہیں ہوتی؟ کوئی عورت یا نابالغ بچہ امان دے، یا قیدیوں کے ساتھ جس کی سابقہ قرابت قائم ہو، وہ اگر دعویٰ امان کرے تو بغیر ثبوت کے ان حضرات کا دعویٰ معتبر نہیں ہوتا، جب کہ یہ مسلمان ہیں، یہاں قیدی مال غنیمت کا حصہ بن چکے ہیں، مسلمانوں کا حق ان سے وابستہ ہو چکا ہے، ان کا دعویٰ امان ظاہر حال کے خلاف ہے، اس لیے تحقیق ضروری ہے۔ جب بھی ظاہرِ حال کے خلاف کوئی دعویٰ سامنے آئے گا، اس کی تحقیق کی جائے گی اور بغیر ثبوت کے اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بدر کے قیدیوں میں سے حضرت عباسؓ بھی تھے۔ انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا دعوی کیا،

تاکہ فدیہ سے مستثنیٰ قرار پائیں، مگر اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اللّٰہ أعلم بأسلامک، ان یک ماتقول حقاًفاللہ یجزیک بہ، فأما ظاھرک فکان علینا، فافد نفسک"

'اللہ کو آپ کے اسلام کی زیادہ خبر ہے۔ اگر جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، سچ ہے تو اللہ آپ کو اس کا بدلہ دے گا، رہا آپ کا ظاہر تو وہ ہمارے خلاف ہے۔ اس لیے آپ کو فدیہ ادا کرنا پڑے گا'۔

اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بیس (۲۰) اوقیہ سونا ضبط کر کے مالِ غنیمت میں شامل کیا گیا۔ انہوں نے کہا: اس کو میرے فدیہ میں شمار کرلیا جائے۔ مگر ان کی یہ درخواست بھی مسترد کر دی گئی اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لا، ذلک شئی أعطانا اللہ منک"

'نہیں، یہ تو اللہ نے آپ سے ہمیں عطا فرمایا ہے'۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو الگ سے پورا فدیہ ادا کرنا پڑا اور ان کا دعویٰ اسلام اور مال غنیمت میں ضبط شدہ ان کا مال ان کے معاملے میں کام نہ آیا۔ ۶۲ ؎ زیر بحث مسئلہ کے لیے یہ ایک بہترین نمونہ ہے۔

جنگ کے وقت اگر دشمن مسلم بچوں کو ڈھال بنالیں

قلعہ کے محاصرہ یا جنگ کے وقت اگر دشمن مسلم قیدی بچوں کو ڈھال کے طور پر سامنے رکھ لیں، تاکہ مسلمانوں کے حملے سے بچ سکیں تو ایسے موقع پر کیا اسلامی لشکر کو حملہ روک دینا چاہیے؟ امام اوزاعیؒ کے نزدیک مسلمانوں کو حملہ بند کر دینا چاہیے، اس لیے کہ اس صورتِ حال میں خود مسلمان معصوم بچوں کو اپنے ہاتھوں شہید کر دینا لازم آئے گا۔ قرآن کریم میں اس کی ممانعت آئی ہے:

"وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ (الفتح: ۲۵)

'اگر مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم نہیں جانتے، کہ ان کو تم

رونڈ ڈالو، اوران کی وجہ سے تم کوانجام میں کوئی مصیبت پہنچے۔

حنفیہ کی رائے میں جنگی حکمت عملی کے تحت حملہ جاری رکھنا چاہیے۔اس لیے کہ یہ دشمن کی چال ہے، جو اس نے مسلمانوں کو مجبور کرنے اور جنگ کو ٹالنے لیے اختیار کی ہے۔آیت سے اس صورت حال پر استدلال صحیح نہیں ہے۔اس لیے کہ اگر مسلمان بچوں کو قتل اور زخمی کرنا جائز نہیں، تو خود کفار کے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے بھی شریعت میں منع کیا گیا ہے۔تیر، بندوق، منجنیق یا میزائل وغیرہ میں بچے، عورتیں، بوڑھے اور بیمار سب زد میں آتے ہیں، تو پھر جنگ ہی نہ کی جائے؟ جب کہ رسول اللہ ﷺ نے کھلے میدان میں بھی جنگ کی ہے اور قلعوں پر بھی حملوں کی اجازت دی ہے۔خود آپؐ نے اہلِ طائف کا مسلسل سترہ (۱۷) دنوں یا ایک ماہ تک محاصرہ فرمایا اور بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے ان پر منجنیق نصب فرمائی۔ ۶۳؎ اسکندریہ پر حضرت عمرو بن العاصؓ کا منجنیق نصب کرنا تو بہر حال ثابت ہے۔ ۶۴؎ اسی طرح قیساریہ کی فتح بھی حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانے میں ہوئی۔اس میں ساٹھ (۶۰) منجنیقوں کا استعمال کیا گیا تھا۔اس جنگ میں امیر لشکر حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ تھے۔

دارالحرب میں امیر لشکر کا اسلامی سزائیں جاری کرنا

دارالحرب میں جنگ کے دوران اگر مسلم فوجیوں میں سے کسی سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو جائے جس پر حد لازم آتی ہے تو کیا امیر لشکر اپنے طور پر مجرم پر حد جاری کرسکتا ہے؟ امام اوزاعیؒ امیر لشکر کو امیر شہر کا قائم مقام قرار دے کر اسلامی حد جاری کرنے کا اختیار دیتے ہیں، لیکن حنفیہ اسے یہ اختیار نہیں دیتے۔ان کے نزدیک امیر شہر کی اجازت کے بغیر اجراء حد کی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔دارالحرب میں حد جاری کرنے کی صورت میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ مجرم بددل ہو کر اہل حرب سے مل سکتا ہے۔یہاں شیطانی تحریض کے مواقع زیادہ ہیں۔اس لیے حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عمیر بن سعید الانصاریؓ دارالحرب میں حد جاری کرنے سے روکتے تھے۔اور اس خطرہ کی طرف اشارہ فرماتے تھے۔ ۶۶؎

دوران جنگ دشمن کے درخیوں کو کاٹنا

امام اوزاعیؒ کے نزدیک جنگ کے دوران دشمن کے علاقے میں ہرے درخیوں اور کھیتوں کو کاٹنے اور جلانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ فساد برپا کرنا ہے اور قرآن کریم میں ایسا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے:

''وَإِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الأَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیهَا وَیُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لاَ یُحِبُّ الفَسَادَ'' (البقرۃ:۲۰۵)

'جب اسے اقتدار حاصل ہوتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے، حالاں کہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا'۔

نیز حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یزید بن ابی سفیانؓ کو شام کی طرف روانہ کرتے ہوئے وصیت فرمائی تھی:

''لاتقطعو اشجراً و لاتخربو او لاتفسدو اضرعاً''۶۷؎

'کسی درخت کو نہ کاٹنا، تباہی نہ مچانا، کسی دودھ دینے والے تھن کو خراب نہ کرنا'۔

لیکن حنفیہ کے نزدیک اگر کام یابی کی کوئی اور صورت نہ ہو تو جنگی حکمت عملی کے طور پر کفر کی شوکت توڑنے کے لیے درخیوں وغیرہ کو کاٹنے کی اجازت ہے۔ بنو قریظہ سے جنگ کے وقت خود قرآن کریم نے اس کی اجازت دی تھی اور مسلمانوں نے اس پر عمل کیا تھا:

''مَا قَطَعْتُم مِّن لِّینَةٍ أَوْ تَرَکْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلٰی أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللّٰهِ وَلِیُخْزِیَ الْفَاسِقِینَ''(الحشر:۵)

'جو تم نے کھجور کے درخت کاٹ دیے یا ان کی جڑوں پر کھڑے چھوڑ دیے وہ اللہ کے حکم سے ہے، تاکہ گنہگاروں کو رسوائی کا سامنا ہو'۔

البتہ اگر اسلامی افواج کے غلبہ کی امید ہو تو اس طرح کے کاموں کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ممانعت اسی پر محمول کی گئی ہے۔ اس لیے کہ اسی وصیت میں ان کا یہ جملہ بھی نقل کیا گیا ہے:

''فان اللہ ناصر کم علیھم''

'اللہ تعالیٰ تم کو ان پر غلبہ دینے والے ہیں'

امام محمد نے السیر الکبیر میں یہی جواب دیا ہے۔ ۶۸

دارالاسلام میں ویزہ لے کر آنے والا شخص اگر کسی جرم کا ارتکاب کرے

ویزہ لے کر آنے والا شخص اگر کسی شدید جرم، مثلاً زنا اور چوری وغیرہ کا مرتکب ہوجائے تو کیا دارالاسلام کے قانون کے مطابق اس پر حد جاری کی جائے گی؟ اس معاملہ میں اوزاعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اسلامی قانون کے مطابق اس کو سزا دی جائے گی۔ جب کہ حنفیہ کے نزدیک وہ ویزہ لے کر آنے والا شخص اسلامی قانون کا پابند نہیں ہے اور نہ اس سے یا اس کے ملک سے اس طرح کا معاہدہ ہے۔ اس لیے اس پر کوئی حد جاری نہیں ہوسکتی، جس طرح کہ دارالحرب کے سفراء اسلامی حدود سے مستثنیٰ ہیں۔ جب تک آدمی اسلامی شہریت اور دارالاسلام کی قانونی اطاعت قبول نہ کر لے، اس وقت تک اسے اسلامی قوانین کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔

دارالحرب میں سودی کاروبار

امام اوزاعیؒ کے نزدیک اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں ویزہ لے کر داخل ہو اور وہاں غیر مسلموں سے سودی معاملات یا عقد فاسد کرے تو یہ جائز نہیں، اس لیے کہ سود مسلمان کے لیے حرام ہے، خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر تمام سودی معاملات کو کالعدم قرار دیا تھا اور سب سے پہلے حضرت عباسؓ کے سود کو باطل قرار دیا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ، ابراہیم نخعیؒ اور سفیان ثوریؒ کے نزدیک دارالحرب میں سودی معاملات یا عقود فاسدہ غیر مسلموں کی مرضی سے کیے جائیں اور ان میں کسی قسم کا فریب

نہ دیا گیا ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ دار الحرب کے کفار قانون اسلام کے پابند نہیں ہیں اور یہ ان کے قانون کے مطابق جرم نہیں ہے۔ حضرت عباسؓ کے سود کو حضورؐ نے فتح مکہ کے موقع پر ممنوع قرار دیا تھا، جب کہ حضرت عباسؓ بدر سے پہلے ہی مسلمان ہو گئے تھے اور مکہ والوں سے ان کا سودی کاروبار جاری تھا، لیکن حضورؐ نے ان کو نہیں روکا، البتہ جب مکہ دار الاسلام بن گیا تب آپؐ نے اس پر پابندی عائد فرمائی۔ یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ دار الحرب میں سودی کاروبار کی گنجائش ہے۔۶۹ قاضی ابو یوسفؒ نے اس معاملہ میں اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کے بجائے امام اوزاعیؒ کی تائید کی ہے ،لیکن ساتھ ہی انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی رائے کو بھی مدلل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسلام چھوڑ کر نصرانیت یا یہودیت قبول کرنے والے کا حکم

اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی ہو جائے اور کسی یہودی یا عیسائی ملک میں جا کر وہاں کا شہری بن جائے تو ذبیحہ اور نکاح کے معاملہ میں اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا؟ امام اوزاعیؒ کے نزدیک جو شخص جس قوم میں شامل ہو جائے وہ اسی کے حکم میں ہوتا ہے، اس لیے یہودیت و نصرانیت اختیار کرنے کے بعد اس شخص کے ساتھ بھی اہل کتاب کا معاملہ کیا جائے گا اور اس کا ذبیحہ کھانا اور اس کی عورت سے نکاح کرنا درست ہوگا۔ حنفیہ کے نزدیک ارتداد کے بعد وہ شخص خواہ کوئی مذہب اختیار کر لے، مرتد ہی رہے گا۔ اگر وہ اسلامی ملک میں ہے اور اسلام کی طرف واپس نہیں آتا تو واجب القتل ہے اور اگر ملک چھوڑ کر چلا جاتا ہے تب بھی اس کا ذبیحہ اور اگر وہ عورت ہے تو اس سے نکاح کرنا حرام ہے۔ اہلِ کتاب صرف وہ لوگ سمجھے جائیں گے جو پیدائشی اہلِ کتاب ہوں یا اسلام کو چھوڑ کر اس مذہب میں نہ آئے ہوں۔ ۷۰ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ ۷۱

سطور بالا میں نمونہ کے طور پر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے امام اوزاعیؒ کے مسلکی رخ اور بین الاقوامی مسائل میں ان کے ذوق و مزاج کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک وسیع النظر فقیہ اور اسلام کے زبردست داعی اور نقیب تھے۔ ان کے نظریات اسلامی قانون کی ابدیت اور حقانیت کے آئینہ دار ہیں۔

حواشی ومراجع

۱۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۷ ص ۱۱۶

۲۔ تہذیب الکمال، ج ۱۷، ص ۳۱۳

۳۔ البدایۃ والنھایۃ، ابن کثیر، دار احیاء التراث العربی، ۱۹۸۸ نج ۱۰، ص ۱۱۶

۴۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۷، ص ۱۱۳

۵۔ حوالہ سابق، ص ۱۱۹

۶۔ مختصر تاریخ دمشق، ج ۱۴، ص ۳۲۰

۷۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۷، ص ۱۲۷

۸۔ تسمیۃ فقہاء الأمصار من اصحاب رسول اللہ ومن بعدھم، ابوعبد الرحمن النسائی، دار الوعی حلب، طبع اول، ۱۳۶۹ ج ۱، ص ۱۳۰

۹۔ البدایۃ والنھایۃ، ج ۱۰، ص ۱۱۵، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، تاج الدین السبکی، ج ۱ ص ۳۲۶، مجموعہ فتاوی ابن تیمیہؒ، ج ۲۰، ص ۵۸۳

۱۰۔ طبقات الفقہاء، ابواسحق الشیرازی، تحقیق: احسان عباس، ۱۹۷۰، دار الرائد العربی، بیروت، ج ۱، ص ۷۲

۱۱۔ تاریخ بغداد، الخطیب البغدادی، ج ۱۰، ص ۲۶۵

۱۲۔ طبقات الشافعیۃ، ج ۲، ص ۱۰۲، البدایۃ والنھایۃ، ج ۱۱، ص ۱۲۲

۱۳۔ النجوم الظاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ، ابن تغری بردی، ج ۳، ص ۳۲۰

۱۴۔ البدایۃ والنھایۃ، ج ۱۰، ص ۲۰۹

۱۵۔ الدیباج فی معرفۃ أعیان علماء المذہب، ابن فرحون الیعمری، ج ۱، ص ۱۵۷

۱۶۔ مختصر تاریخ دمشق، ج ۱۴، ص ۳۱۶، ۳۳۹۔ سیر اعلام النبلائ، ج ۷، ص ۱۱۰، البدایۃ النھایۃ ج ۱۰، ص ۱۱۶

۱۷۔ مختصر تاریخ دمشق، ج ۱۴، ص ۳۳۹

۱۸۔ سیر اعلام النبلاء ج ۷ ص ۱۱۱، ۱۲۸

۱۹۔ الفھرست، ابن الندیم، تحقیق رضا، ج ۱، ص ۳۱۸۔ کشف الظنون ج ۲، ص ۱۶۸۳، ۴

۲۰۔ کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۰۱۳، کتاب الام ج ۱، ص ۱۰۱

۲۱؎ امام ابو یوسفؒ کی یہ کتاب علّامہ ابو الوفاء الافغانیؒ کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکی ہے اور بہ آسانی دست یاب ہے۔

۲۲؎ کتاب الام (گیارہ جلدیں) کا ایک مدلل اور محقق نسخہ دارالوفاء قاہرہ سے ۱۴۲۲/۲۰۰۱ء میں شائع ہوا ہے، جس میں امام شافعیؒ کی مشہور کتاب 'الرسالہ' بھی شامل ہے۔ کتاب سیر الاوزاعی اس ایڈیشن میں جلد ۹ ص ۱۷۸ سے ۲۷۷ تک ہے، اور ہر مسئلہ پر نمبر بھی ڈالا گیا ہے۔

۲۳؎ مختصر تاریخ دمشق، ج ۱۴، ص ۲۳ ۳، سیر اعلام النبلاء، ج ۷، ص ۱۴۴

۲۴؎ جب کہ امام محمدؒ کی السیر الصغیر میں ایک سو (۱۷۲) مسائل ہیں اور السیر الکبیر مع شرح السرخسیؒ کا جو نسخہ راقم سطور کے پاس ہے وہ بیروت سے شائع ہوا ہے اور پانچ جلدوں میں تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں دوسو اٹھارہ (۲۱۸) ابواب کے تحت سینکڑوں مسائل زیر بحث آئے ہیں۔

۲۵؎ وفیات الاعیان، ابن خلکان دار صادر۔ بیروت، ج ۳، ص ۱۲۷، البدایۃ والنھایۃ، ج ۱۰، ص ۱۲۰

۲۶؎ کتاب الرد علی سیر الاوزاعی للامام ابی یوسفؒ، ص ۵

۲۷؎ کتاب الام، ج ۹، ص ۱۷۵، کتاب سیر الوزاعی

۲۸؎ کتاب الرد علی سیر الاوزاعی للامام ابی یوسفؒ، ص ۵

۲۹؎ المبسوط للسرخسی، باب معاملۃ الجیش مع الکفار، ج ۱۰، ص ۵۴، دراسۃ وتحقیق: خلیل محی الدین المیس، دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۰ئ، طبع اول

۳۰؎ صحیح بخاری: ۲۹۶۹

۳۱؎ سنن البیھقی الکبریٰ، ج ۶، ص ۲۹۳، حدیث نمبر: ۱۲۴۹۸

۳۲؎ کتاب الرد علی سیر الاوزاعی للامام ابی یوسفؒ، ص ۱۳، مع حاشیۃ الافغانی

۳۳؎ کتاب الرد علی السیر الاوزاعی للامام ابی یوسفؒ، ص ۱۳۔ ۱۴

۳۴؎ کتاب الام ج ۹، ص ۱۸۱

۳۵؎ ملاحظہ کیجیے: بخاری: ۲۹۰۸، مسلم: ۳۲۳، ترمذی: ۱۵۷۲

۳۶؎ سنن البیھقی الکبریٰ، ج ۹، ص ۶۲، حدیث: ۱۷۷۹۱

۳۷؎ شرح معانی الآثار، طحاوی، ج ۴، ص ۲۷۷

۳۸؎ شرح معانی الآثار، ج ۳، ص ۲۵۲، حدیث: ۱۴۸۵۳

۳۹؎ کتاب الام، ج ۹، ص ۱۸۰

۴۰؎ الترمذی، حدیث: ۱۴۷۵

۴۱؎ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، زیلعی، ج ۳، ص ۲۵۴، دار الکتاب الاسلامی، القاھرۃ، ۱۳۱۳ھ، حاشیۃ رد المحتار علی الدر المختار، ابن عابدین، ج ۴، ص ۱۵۵، دار الفکر للطباعۃ والنشر بیروت ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء

۴۲؎ مسلم، ج ۵، ص ۱۸۹، : ۴۷۷۹

۴۳؎ ابو داؤد ج ۳، ص ۲۸: ۲۷۳۸۔

۴۴؎ کتاب الرد علی سیر الاوزاعی للامام ابی یوسفؒ، ص ۲۱ مع حاشیۃ الافغانیؒ

۴۵؎ حوالۂ سابق، ص ۲۳

۴۶؎ حوالۂ سابق، ص ۲۴

۴۷؎ حوالۂ سابق، ص ۳۵

۴۸؎ سنن البیہقی الکبری، ج ۹، ص ۵۰ حدیث: ۱۷۷۳۴

۴۹؎ حوالۂ سابق، حدیث نمبر: ۱۷۷۳۱

۵۰؎ کتاب الام، ج ۹، ص ۱۸۰

۵۱؎ ابو داؤد، کتاب الجہاد، حدیث: ۲۷۲۳، ابن ابی شیبہ، المصنف کتاب الجہاد، ج ۷، ص ۷۲۸

۵۲؎ سنن البیہقی الکبریٰ، ج ۶، ص ۳۳۲

۵۳؎ حوالۂ سابق

۵۴؎ ابو داؤد: ۲۷۳۰، مسند أبی یعلیٰ، جلد ۴، ص ۴۲۳، حدیث: ۲۵۵۰، اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

۵۵؎ کتاب الرد علی سیر الاوزاعی للامام ابی یوسفؒ، ص ۳۸

۵۶؎ کتاب الأم، ج ۹، ص ۱۹۹

۵۷؎ السنن الکبری للبیہقی، ج ۹، ص ۳۶، حدیث: ۱۸۳۳۴